R.N. No. 2186/57 [Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت

ٹیلی فون - ۲۹
قیمت تین پیسے
فی پرچہ

جلد ۲۵ - شمارہ ۴ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ جنوری ۱۹۶۶ء

اداریہ

چھبیس جنوری

اس ۲۶ جنوری کو ہماری جمہوریت کی عمر سولہ سال کی ہو جائے گی۔ گویا اس نے اب طفلی سے نکل کر جوانی کی منزل میں قدم رکھا ہے۔ اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ۔

پچھلے سال اس موقع پر ہمیں اپنا معمارِ اعظم جواہر لال نہرو بے اختیار یاد آیا تھا۔ آج اس کی یاد کے ساتھ اس کے جانشین اور مادرِ ہند کے سپوت لال بہادر شاستری کی یاد بھی مل گئی ہے جس نے صرف انیس مہینے ہندوستان کی رہنمائی کی، مگر اس عرصے میں رزم و بزم دونوں پر اپنا غیر فانی نقش ثبت کر گیا۔ خطرے کے وقت اس نے جس ہمت و جرأت سے میدانِ جنگ میں ہندوستان کا پرچم بلند کیا تھا، اسی طرح ہمت و جرأت سے تاشقند میں امن و صلح کے لیے جدوجہد کی اور اس جدوجہد کی وجہ سے اس پر اتنا بوجھ پڑا کہ دل کی حرکت بند ہو گئی۔ گاندھی جی نے ہندوستان کو حق و صداقت اور امن و اخوت کے راستے پر چلنا سکھایا۔ جواہر لال نہرو نے جمہوریت اور سیکولرزم کی بنیاد ڈالی اور سوشلزم کی منزل کی طرف ہمیں گامزن کیا اور لال بہادر شاستری نے معاملاتِ زندگی میں سیرت فولاد اور شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں کا نقشہ ہمارے لیے پیش کیا۔ اس دفعہ یومِ جمہوریت کے موقع پر ہمیں ان تینوں کے کارنامے کو سامنے رکھنا ہے اور ان کے کام کو آگے بڑھانا ہے۔

اس دنیا میں جو آیا ہے اسے ایک دن جانا ہے۔ ہاں جس کی زندگی ملک و قوم اور انسانیت کی خدمت کے لیے وقف ہو، وہ مرنے پر بھی زندہ رہتا ہے۔ گاندھی جی شہید ہو گئے، جواہر لال اور شاستری کو موت کے ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا، مگر ہندوستان زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اس کے پاس ایک شاندار نصب العین ہے، اس کی ایک عظیم تاریخ ہے، اس کے وسائل بے شمار ہیں، اس کی طاقت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ ابھی جہالت، غریبی، بیماری کی لعنتوں سے رہائی حاصل نہیں کر سکا ہے۔ ابھی اس کے بہت سے شہری بنیادی ضروریات کو ترستے ہیں، غذا کے لیے ابھی اسے دوسرے ملکوں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے، اس کے کھیتوں میں اب بھی بھوک اگتی ہے۔ اس نے ہر بالغ کو ووٹ کا حق دیا ہے مگر ووٹ اب بھی ذات پات، مذہب، علاقے، زبان سے وفاداری کی بنا پر دیے جاتے ہیں۔ ابھی یہاں خواندگی کی شرح بہت کم ہے۔ ابھی جدید دور کی ضرورتوں کا احساس عام نہیں ہے۔ ابھی یہاں بہت سے لوگ صدیوں پہلے کے ان خیالات پر جمے ہوئے ہیں جو اب فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ابھی قول اور فعل میں بڑا فرق ہے۔ ابھی قانون کا احترام نہیں ہے، اس کا خوف ہے۔ ابھی ملک کی رنگا رنگی پر فخر نہیں ہے، ایک بے روح یکسانیت پر اصرار ہے۔ ابھی اقلیتوں سے وہ سلوک عام نہیں ہے کہ ان میں فخر و اعتماد کے ساتھ ملک کی خدمت کا جذبہ بیدار ہو۔ ابھی تمام قومی زبانوں کو ترقی کے مواقع نہیں ملے۔ ابھی تک باتیں بنانے کا مرض عام ہے، عمل کی صلاحیت کم ہے۔ ابھی تک وہ لوگ جو سچے ہندوستانی ہیں، ملک میں سب سے کم تعداد میں ہیں۔

اس لیے اس بار پھر ہمیں اپنے سے عہد کرنا چاہیے کہ ہم اس حالت کو بدلیں گے، ملک و قوم کے مفاد کو ذاتی یا علاقائی یا اپنے گروہ کے مفاد

اس شمارے میں

پر مقدم قرار دیں گے۔ ملک سے مطالبہ کم کریں گے اسے دیں گے زیادہ اپنے اپنے دائرے میں اپنا کام ٹھیک کریں گے احساس کو بیدار کرنے میں لگ جائیں گے اپنی تہذیب کو برقرار رکھیں گے اور دنیا کی ترقی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہیں گے یک جہتی اور امن کے خود بھی پجاری ہوں گے اور دوسروں کو اس راہ پر لائیں گے جذبے کو تہذیب سکھائیں گے اور جوش کو ہوش۔ ظلم کو انسانیت سے بچائیں گے اور عمل کو گرد از نے سے۔ سیاست کو اخلاق کے آداب عطا کریں گے اور نوجوانوں کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دینے یا شکنجے میں کسنے کی بجائے انہیں ملک کی خدمت کے اس نصب العین سے آشنا کریں گے جو خود بخود نظم سکھا دیتا ہے مگر جس میں تادیب کے بجائے تربیت اور دھمکی کے بجائے لاڈ پیار سے کام لیا جاتا ہے۔ ہندوستان زندہ باد۔ جمہوریت پائندہ باد۔

آہ جہاں بانو نقوی

یہ خبر افسوس سے سنی جائے گی کہ یکم جنوری کو جہاں بانو نقوی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔ ہماری زبان کے پڑھنے والے ان کے مضامین اور مراسلات سے اچھی طرح واقف ہوں گے مرحوم بڑا پاکیزہ ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ ان کا ادب کا مطالعہ گہرا تھا اور وہ ہمارے کلاسیکل سرمایے پر بڑی گہری نظر رکھتی تھیں۔ حیدرآباد کی فضاؤں میں خصوصاً اور اردو دنیا میں عموماً ان کی کمی برابر محسوس کی جائے گی ادارہ ہماری زبان اپنے ایک مخلص معاون اور ہمدرد کے غم میں سوگوار ہے۔

ڈاکٹر ہاشمی شعبۂ اردو کے پروفیسر مقرر

لکھنؤ۔ ۱۰ جنوری۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صدر شعبۂ اردو و فارسی (لکھنؤ یونیورسٹی) کو شعبۂ اردو و فارسی میں نئی قائم ہونے والی پروفیسر شپ کے لیے ایگزیکیٹو کونسل نے منتخب کر لیا ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر شپ قائم کرنے کا فیصلہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے عرصہ ہوا کیا تھا اور اس سلسلے میں ریاستی سرکار سے کہا تھا کہ وہ پروفیسر کے مصارف کا نصف بار اٹھائے گزشتہ سال ریاستی سرکار اس بار کو اٹھانے پر رضامند ہوئی۔

ڈاکٹر ہاشمی جو شعبہ اردو و فارسی میں بہ حیثیت ریڈر متعین ہیں چند ماہ سے اردو شعبے کے عارضی پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اب ایگزیکیٹو کونسل نے اپنے حالیہ جلسے میں ڈاکٹر ہاشمی کو مستقل پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کرنے کا فیصلہ دے دیا ہے۔

مرزا غالب پرائز

دہلی۔ ۲۱ دسمبر۔ دہلی یونیورسٹی کے ایک خصوصی جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر اردو کے نوجوان شاعر سید نظر برنی کو دہلی یونیورسٹی کے پرو چانسلر اور سپریم کورٹ آف انڈیا کے چیف جسٹس جناب پی بی گجندر گڈکر صاحب نے اپنے دست مبارک سے دہلی یونیورسٹی کا "مرزا غالب پرائز" رحمت فرمایا۔ سید نظر برنی نے اس سال دہلی یونیورسٹی کے بی۔ اے کے تمام طلبا میں اردو کے مضمون میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے ہیں۔

بنگلہ ادب کی تاریخ

ماسکو (تاس) علم الہند کی سوویت ماہر الینا توسیتیخ کی کتاب "بنگلہ ادب کی تاریخ" سوویت سائنس اکادمی کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں بنگلہ ادب کی روایات، کلاسیکی میراث کے تجزیے کے ساتھ ہی عصر حاضر کے بنگلہ ادب پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ تاریخ کا آغاز دسویں صدی سے ہوتا ہے جب ایک آزاد زبان کی حیثیت سے بنگلہ زبان کی نشو و نما شروع ہوئی۔ بنگالی کے قدیم مسودے "چریاپد" کا ذکر کیا گیا ہے جو بارھویں صدی کی تصنیف ہے۔ جے دیو کی شاعری کا ذکر بھی ہے جس کی نظم "گیت گووند" کی بڑی اہمیت ہے۔ ٹیگور، سرت چندر چٹوپادھیا اور قاضی نذر الاسلام کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

مخدوم کی خدمات کا اعتراف

اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین کے اعزاز میں گزشتہ ہفتہ آندھرا پردیش کی وزارت تہذیبی امور کی طرف سے ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی گئی۔ اس موقع پر مخدوم محی الدین کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک شال اور پھول مالا پیش کی گئی۔ مخدوم نے اپنی بعض منتخب نظمیں سنائیں۔ آندھرا پردیش کے وزیر کلچرل امور ایم آر اپاراؤ نے اس جلسے کی صدارت کی جو حیدرآباد کلب میں منعقد ہوا تھا۔

۲۵۰ سال پرانی عربی اور فارسی کی انسائیکلوپیڈیا

آگرہ۔ ۰ جنوری۔ آگرہ کے ایک شخص کے پاس ایک کتاب "تاج اللغات" ملی ہے جو عربی اور فارسی کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کی چھپائی لیتھو کی ہے اور یہ ۲۵۰ سال پرانی ہے۔ اس کے ہر صفحہ پر اودھ کے حکمران حامد علی شاہ کی مہر ثبت ہے۔ یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے ہر جلد میں آٹھ سو صفحات ہیں۔ کاغذ کھردرا سا ہے۔

للت کلا اکیڈمی کے نئے صدر

نئی دہلی ۲۹ دسمبر ۱۹۶۵ء مشہور ادیب اور نقاد ڈاکٹر ملک راج آنند کو یکم جنوری ۱۹۶۶ء سے ۵ سال کی مدت کے لیے للت کلا اکیڈمی کا صدر مقرر کیا گیا ہے۔

ماہنامہ کتاب کا سالنامہ شایع ہوگیا

اس سالنامہ میں جو ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے آل احمد سرور صاحب سے ایک بھرپور انٹرویو کے علاوہ فراق گورکھپوری، احتشام حسین، رام لعل، ڈاکٹر محمد حسن، خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، شمیم حنفی، حیات اللہ انصاری، اقبال متین، منظر سلیم، احمد جمال پاشا، قاضی عبدالستار، کوثر چاندپوری، زبیر رضوی اور بہت سے مشاہیر کی تخلیقات شامل ہیں۔ سالنامہ کی قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے ہے۔

مختار ٹونکی

اختر شیرانی کا رومان

"ہماری زبان" مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۶۵ء اور ۵ اکتوبر ۱۹۶۵ء کے شماروں میں اختر شیرانی کے ادبی رسالے "رومان" پر تعارفی نوٹ بامرہ نواز ہوئے۔ مطالعہ سے پتہ چلا کہ "رومان" اختر شیرانی اور عاشق بٹالوی کی ادارت میں مئی ۱۹۳۵ء سے نکلنا شروع ہوا تھا اور سید امتیاز علی تاج، سید حسن جعفری اور جوش ملیح آبادی اس کے نگارندگان خصوصی تھے۔ رومان کا ایک شمارہ بابت ماہ جنوری ۱۹۳۷ء میری فائل میں بھی محفوظ ہے جو خصوصی نمبر یا سالنامہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ امر میرے لیے باعث تعجب ہوا کہ عاشق بٹالوی اور مذکورہ نگارندگان خصوصی کے اسمائے گرامی از اول تا آخر کہیں ضمناً بھی دیکھنے کو نہ ملے۔

سرورق سے قطع نظر صفحۂ اول پر اس طرح مرقوم ہے:۔

ہو زاہد سے کیوں ہے اس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخئیل اختر میں
(آغا حشر کاشمیری)

سالنامہ
رسالہ رومان لاہور
جنوری ۱۹۳۷ء

مرتبہ
اختر شیرانی
دفتر رومان ۸ فلیمنگ روڈ۔ لاہور

چندہ سالانہ پانچ روپے قیمت سالنامہ بارہ آنے

۱۴۰ صفحات کی تعداد پر مشتمل اس شمارے کی فہرست مضامین درج ذیل ہے۔

اختر شیرانی کے رسائل بہارستان، انتخاب، خیالستان، رومان، سہیلی اور شاہکار وغیرہ کو زیادہ مدت نہیں گزری ہے۔ کوشش و تلاش سے ان رسالوں کی فائلیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اپنے باپ علامہ شیرانی کی طرح اختر کی طبیعت بھی خالص تحقیقی اور علمی مسائل کی طرف مائل تھی۔ وہ ایک ادیب اور صحافی کی حیثیت سے بھی بہت وقیع درجہ رکھتے ہیں مگر ان کے نثری کارنامے پردۂ خفا میں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مداحین بھی اس بات سے واقف نہیں کہ وہ ایک اچھے نثر نگار اور لائق صحافی بھی تھے۔ یونس حسنی نے "نخلستان" اودے پور کے پہلے شمارے میں ان کی نثری تصانیف پر کچھ روشنی ڈالی تھی مگر ان کا مضمون اتنی روا روی میں لکھا گیا ہے کہ تشنگی اور بے مائگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ کچھ تحقیقی شغف سے متصف حضرات اس طرف توجہ دیں اور ان کے ناولوں ترجموں و دیگر نثری کتابوں کا بسیط جائزہ لے کر اردو نثر کی تاریخ میں ان کا صحیح مقام متعین کریں۔

سناظر عاشق ہرگانوی

دہ مجلس کا اردو ترجمہ؟

(ہماری زبان" کے ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں "فضلی کی کربل کتھا یا دہ مجلس شایع ہوگئی" کا اعلان نظر سے گزرا۔)

"دہ مجلس" کا ترجمہ فارسی سے اردو میں ۱۲۲۳ھ "محمد رحمت اللہ نام، قوم انصاری، متخلص قیدی" نے کیا تھا اور اس کا تاریخی نام "ترجمہ مجلس ماتم کا" رکھا تھا۔ پھر اسی ترجمہ کو سید علی حافظ نے ۱۲۲۸ھ میں نقل کیا تھا اور ۱۲۳۶ھ میں موضع نگرسن، تحصیل ہنڈیہ، ضلع الہ آباد کے میر باقر علی کے امام باڑے میں نذر کیا تھا۔ سر کتاب پر یہ عبارت تھی "بتاریخ عزہ محرم الحرام سنہ ۱۲۳۶ ہجری قدسے ایں کتاب سیبت اختصاب رامیر گشتہ وادی عصیان احقر الناس علی حافظ برائے داخل شدن ثواب جماعتے مومنین در امام بارہ سیدی سندی میر باقر علی صاحب نذر نمودہ۔"

محمد رحمت اللہ نے کتاب کی وجہ تالیف یہ لکھی ہے۔

"اکثر مومنین محرم کی چاندرات سے تعزیہ داری کی مجلس میں کتاب سننے کو اس غریب بیکس کے یہاں آتے تھے (محمد رحمت اللہ نے اپنی سکونت اور پتہ یوں لکھا ہے "ساکن شہر بیکسی مقیم محلہ تنہائی"۔ شاید اس کی وجہ ناداری اور انکساری ہو اور نام ونمود کا انھیں کوئی شوق نہ ہو؟ م۔ ع۔ ہ) لیکن سچ یوں ہے کہ ان میں جو صرف اشخاص (؟) یا اہل علم تھے ان کو تو احوال کتاب کا ظاہر ہی تھا مگر بعض عوام الناس کہ بے علم محض تھے ان کے تئیں نقط ورود خاطر ہی تھا۔ اگرچہ پڑھنے والا عبارت کے ساتھ مگر دو معنی بھی کہتا تھا تس پر بھی بسبب فارسیت کے مضمون مدعا کا سمجھنے سے رہتا تھا تو اسی واسطے اس ہیچمدان نے ترجمہ دہ مجلس کا عبارت نثر میں بیچ ریختہ زبان کے لکھا۔"

ترجمہ میں نہ تو آورد ہے نہ تصنع نہ پرشکوہ الفاظ ہیں، نہ سجی ہوئی تشبیہیں، نہ خلاف فطرت عناصر کی چاشنی ہے، نہ رومانیت کا غلبہ۔ سیدھی سادی بات ہے مگر بلا کا اثر اور غضب کی سادگی ہے۔ (۱۲۲۳ھ کی زبان کو دیکھتے ہوئے) ساری کتاب ترجمہ ایک سو ستر (۱۷۰) صفحات کی ہے۔ ہر صفحے میں ۱۳ سطریں ہیں۔ پندرہ سولہ الفاظ فی سطر کا اوسط ہے۔ ہر باب سے ایک نئی شہادت شروع ہوتی ہے۔ ۱۷۰ صفحہ تک دس شہادتیں یا مجلسیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اس کے بعد "شمہ از حالات بعد شہادت حضرت سید الشہدا امام حسین علیہ السلام ہے۔"[1]

لیکن ہندوستانی اکیڈمی کے سہ ماہی رسالہ "ہندوستانی" کے جولائی ۱۹۳۷ء کے شمارہ میں صفحہ ۳۲۵ پر درج ہے کہ "میر فضلی نے سنہ ۱۱۴۵ھ مطابق سنہ ۱۷۳۲ء میں "روضۃ الشہدا" کا ترجمہ فارسی سے اردو نثر میں کیا اور اس کا نام "دہ مجلس" رکھا۔ اس کتاب میں "ائمہ" معصومین کی شان میں کچھ نظمیں اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔"[2]

لیکن یہ کیونکر ممکن ہے کہ فضلی نے "روضۃ الشہدا" کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا اور اس کا نام "دہ مجلس" رکھا۔ پھر محمد رحمت اللہ نے "دہ مجلس" کا ترجمہ فارسی سے، اردو میں کرکے اس کا نام "ترجمہ مجلس ماتم کا" رکھا؟

پھر فضلی کی کربل کتھا یا دہ مجلس شائع ہوگئی" کے اشتہار سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کتاب فارسی میں شائع ہوئی ہے یا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے؟

[1] رسالہ سہ ماہی "اردو" اورنگ آباد (دکن)، اپریل ۱۹۳۴ء ص ۲۷۴ تا ۲۷۵۔

[2] تاریخ ادب اردو، حصہ نثر ص ۳۔

قطعات عید

واصف پریمی

عداوتوں کو مٹاؤ کہ عید کا دن ہے
وفا کا ہاتھ بڑھاؤ کہ عید کا دن ہے
جنھیں سمجھتے رہے ہو تم آج تک دشمن
گلے انھیں بھی لگاؤ کہ عید کا دن ہے

یہ سچ ہے عید پیام نشاط لاتی ہے
امیر کے لیے لیکن سعید ہوتی ہے
شکستہ دل، نظر افسردہ، حال آشفتہ
کسی غریب کی اس طرح عید ہوتی ہے

جو بات روز کی ہے اس کو چھوڑیے لیکن
نظر اداس ہے رخ زرد عید کے دن بھی
عجب نظام ہے مصروف عیش کوئی ہے
کوئی ہے وقف غم و درد عید کے دن بھی

غزلیں

حسن کمال

نقش بھی اس کے یاد نہیں ہیں نام بھی کچھ کچھ بھول چلا ہے
جانے ہر چہرے پر ہم کو کس کا چہرہ یاد آتا ہے
پہلے بھی گہنایا ہوا تھا، دھندلا نور لٹاتا تھا
اب آنا ہے نام کا وہ اندھا سورج بھی ڈوب چکا ہے
یہ تو نہیں اب ہی سوتے ہوں، صبح یقیں ست ٹوٹ گیا
کوئی تیری آس لگائے، جانے کب سے جاگ رہا ہے
پہلے تصور ہجر کا ہم کو، کتنی لذت دیتا تھا
ہجر میں سچ مچ کیا ہوتا ہے اب جا کر احساس ہوا ہے
آوازوں کا راج ہے اس میں شور کا سکہ چلتا ہے
نگروں نے کچھ سوچ سمجھ کر خود چپ کا بن باس لیا ہے
ہنگاموں سے بھری پڑی سڑکوں کو شاید علم نہیں
سونی سونی راہگذاروں کے اوپر کیا ظلم ہوا ہے
یہی حسن اب سرمایہ ہے خون جگر بھی دے کے بچاؤ
ایسی طوفانی راتوں میں جو اک آدھ دیا جلتا ہے

قیصر تمکین

نظر قاتل بھی ہے تسکین جاں بھی
خزاں بھی ہے بہار بے خزاں بھی
کیے جا سجدہ ہائے شوق پیہم
کبھی تو سجدے ہوں گے کامراں بھی
جو گل روح روان گلستاں ہے
وہی گل ہے حریف گلستاں بھی
تری جو غم حریف زندگی ہے
وہی غم ہے حیات جاوداں بھی

سوویت یونین میں اردو ادب کی مقبولیت

پرموشکن

سوویت یونین میں اردو ادب کو کافی مقبولیت حاصل ہے۔ اگر ہم اردو کے ان شاعروں اور ادیبوں کی فہرست پر نظر ڈالیں جن کی تصانیف سوویت یونین میں شایع ہو چکی ہیں تو ہمیں ان تمام شاعروں اور ادیبوں کے نام نظر آئیں گے جو اردو ادب میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً میر امن کی تحریریں جنھیں اردو نثر کی داغ بیل ڈالنے والے ادیبوں میں گنا جاتا ہے سوویت یونین میں چار مختلف جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی سب سے بہتر کتاب "باغ و بہار" ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں غالب کی غزلوں کا پہلا روسی ترجمہ شائع ہوا تھا اور اس وقت سے لیکر آج تک ان کی دلکش غزلیں مشرقی شعرا کے ان مجموعوں میں برابر جگہ پاتی رہی ہیں جو مستقل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں تک پریم چند اور کرشن چندر جیسے ادیبوں کا سوال ہے، انھیں سوویت عوام میں اتنی ہی مقبولیت حاصل ہے جتنی مغربی یورپ کے کلاسکی ادیبوں کو۔ اس سلسلے میں چند اعداد و شمار حاضر خدمت ہیں۔ پریم چند کے بہترین ناول "گئودان" کی اردو سے ترجمہ ہو کر روسی زبان میں نو لاکھ جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔ کرشن چندر کی تخلیقات کا ترجمہ سوویت عوام کی ۱۲ زبانوں میں ہوا ہے اور ان کی پندرہ لاکھ جلدیں شائع ہوئی ہیں۔

اردو ادب سے سوویت یونین میں دلچسپی صرف ترجموں تک محدود نہیں۔ ہندوستانی ادب کے سوویت ماہروں کا ایک بڑا گروہ اس کے مختلف رجحانات پر وسیع تحقیقی کام کر رہا ہے۔ وہ سوویت قارئین کے وسیع حلقوں کو ممتاز اردو ادیبوں اور شاعروں سے روشناس کرانے کا کام انجام دے رہا ہے اور دلچسپ مقالے شائع کر رہا ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں ہی اس سلسلے کی تین بہترین تصنیفات شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سب سے پہلا مقالہ شرقی اقوام کے ادارے کے ایک رکن سخاچیف کا ہے جنھوں نے اردو ناول میں حقیقت نگاری کی نشو و نما کے ابتدائی مراحل کا جائزہ لیا ہے۔ مقالہ میں میر امن، رجب علی بیگ سرور، نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبد الحلیم شرر اور محمد ہادی رسوا کی تحریروں کا تفصیل کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے۔ تیسرا مقالہ ہندوستانی ادب کی ماہر ریگا رینا کا ہے جنھوں نے اقبال کی ابتدائی رومانی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرا مقالہ کرشن چندر کی تخلیقات سے متعلق ہے

(بشکریہ سوویت دیس)

——×٭×——

محمد اسداللہ

سالہاسال٭

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی ایک تقریر میں یہ جملہ کہا تھا:

"میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو سالہاسال سے ایک ہی صدا سے دعوت بلند کر رہا ہے"

ادارۂ ماہنامہ "تحریک" دہلی نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ:

"یہاں سالہاسال کا استعمال محل نظر ہے بشرطیکہ مولانا آزاد آواگون پر ایمان نہ رکھتے ہوں"

نومبر ۱۹۶۵ء کے "تحریک" میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی نے ادارے کے اس اعتراض کا جواب یہ دیا کہ:

"میری رائے یہ ہے کہ یہاں سالہاسال کا مفہوم سمجھنے میں حاشیہ نگار سے سہو ہوا ہے "سالہا" فارسی میں سال کی جمع ہے اور سالہاسال سے کے معنی "بہت برسوں سے" ہیں۔ حاشیہ نگار نے شاید سالہاسال کے معنی صدہا سمجھ لیے ہیں اور اس طور پر آواگون کا مسئلہ چھیڑ دیا ہے جو بالکل غیر متعلق ہے"

ڈاکٹر صاحب کی اس تحریر پر "تحریک" کے حاشیہ نگار نے پھر یہ حاشیہ لکھا ہے کہ:

"سالہاسال کے مفہوم کے بارے میں مغالطہ حاشیہ نگار کو نہیں بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد اور جناب خلیل الرحمٰن اعظمی کو ہوا ہے۔ سالہاسال ہمیشہ ان گنت برسوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہاں اس کا کوئی محل نہیں ہے۔"

یہ بحث مجھے دلچسپ معلوم ہوئی۔ "سالہاسال" کی تحقیق کے سلسلے میں جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے ارباب نظر کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ "سالہاسال" اور "ان گنت" کا محل استعمال جدا جدا ہے۔

"سالہاسال" کے سلسلے میں میں نے فارسی کی کچھ پرانی لغات دیکھیں مجھے ان میں کہیں "سالہاسال" نہیں ملا۔ اور لغتوں کا کہہ نہیں سکتا۔ جن لغتوں تک میری رسائی ہوئی ہے ان کا حاصل مطالعہ اس سلسلے میں یہ ہے:

فرہنگ آنندراج:

"سالیان بمعنی سالہا نیز در پارسی آمدہ و صحیح است کہ جمع سال باشد و بمعنی مفرد نیز آمدہ برقیاس ماہیان۔ استاد فرخی ؎

زمردی انچہ تو کردی بہ یک بہ اندک کال — بہ سالیان فراوان نکرد رستم زر (؟)

خواجہ نظامی ؎

چناں زی کز اں زیستن سالہا — ترا سود و کس را نباشد زیاں

(ج ۲ ص ۵۸ ۹ مطبوعہ نولکشور ۱۸۹۴ء)

فرہنگ رشیدی: (ملا عبدالرشید تتوی)

"سالیان بمعنی سالہا ۔۔۔۔ بمعنی سال واحد نیز آمدہ"

بہار عجم:

"سالیان جمع سال و بمعنی مفرد نیز آمدہ بر قیاس ماہیان۔ استاد فرخی ؎

زمردی انچہ تو کردی الخ

خواجہ نظامی ؎

چناں زی کز اں زیستن ۔۔۔۔ الخ

(ج ۲ ص ۶۹ مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۵ء)

غیاث اللغات:

"سالیان جمع سال خلاف قیاس و بمعنی سال واحد نیز دریں صورت الف و نون زائد باشد چناں کہ در بہاران ۔۔۔۔ و در سراج چنیں نوشتہ کہ سالیان جمع سالی یعنی چیزی کہ سال ازاں قرار گرفتہ باشد و آں وقت و زمانہ است۔ پس سالیان بمعنی ازمنہ و اوقات باشد"

(پانچواں ایڈیشن مطبوعہ نولکشور ص ۲۱۵)

ان چار فارسی لغتوں میں تو کہیں بھی "سالہاسال" نہیں ملا۔ لیکن سلیمان حییم کی "فرہنگ بجادی فارسی۔ انگلیسی" (مطبوعہ ۱۹۵۳ء) میں یہ دیکھا ہے:

"سالہا (ی سال)، for many years"

اردو لغتوں میں "فیروز اللغات جدید" (طبع چہارم ۱۹۶۳ء) کے صفحہ ۷۵۹ پر "سالہاسال" کو فارسی لفظ قرار دے کر اس کے معنی "برسوں" لکھے ہیں۔

"فرہنگ آصفیہ" نے بھی اسے فارسی قرار دیا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے:

"سالہاسال (ف) تابع فعل۔ برسوں۔ مدتوں قرنوں۔" (طبع اول ج ۳ ص ۱۱)

غالباً یہ ہندوستان کے فارسی دانوں یا اردو دانوں کا مخصوص محاورہ ہوگا جسے بعد میں ایران نے بھی قبول کر لیا ہوگا۔ "سالہا" کے بعد "سال" کثرت کے اظہار کے لیے بڑھایا گیا ہے۔ اس کے آگے حرف ربط "سے" کی وجہ سے تسلسل کا مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کو اور قوی بنانا چاہیں تو "برابر" کا اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً "سالہاسال سے برابر یہ کہتے آئے ہیں"

٭ دسمبر ۱۹۶۵ء کے "تحریک" میں ڈاکٹر اعظمی نے "سالہاسال" کے محل استعمال کی مثالیں اردو کے مستند ادیبوں کے یہاں سے دی ہیں۔

سالہا سال طویل مدت کے لیے مستعمل ہے۔ اسی طرح قرن بھی ہے۔ "قرن" کے متعلق بہارِ عجم کہتی ہے:

"قرن - بالفتح، روزگار و زمانہ و مدت سی سال یا ہشتاد سال یا صد و بست سال و ایں اصح است کذا فی منتخب اوحد الدین انوری

دو قرن از کرمت بردہ جہاں برگ و نوا
توجہ ای کہ جہاں بے تو چو بے برگ و نواست

(ج ۲ ص ۶۷ نولکشور ۱۹۱۵ء)

فرہنگ آنندراج بھی یہی کہتی ہے غیاث اللغات میں لکھا ہے۔
"قرن..... مدت طویل و در تعین آں اختلاف است صاحب قاموس نوشتہ کہ صد سال و در منتخب سی سال یا ہشتاد سال یا صد سال و در برہان ہشتاد سالی و بعضی گویند کہ سی سال است و در صراح و کشف وغیرہ سی سال و فی زمانہا ہمیں مختار است۔"
فرہنگ آصفیہ میں قرن کے معنی ہیں۔
"جگ، دس، بارہ، تیس، اسی، یا ایک سو بیس برس کا زمانہ۔ بعض لوگوں نے صدی کو بھی لکھا ہے۔ لیکن عموماً بارہ برس کے عرصے کو کہتے ہیں۔"

(ج ۳ ص ۸۲ ۳)

فارسی جدید میں قرن صدی کے معنی میں بولا جاتا ہے مثلاً "قرن چہاردہم یعنی چودھویں صدی ہجری" "ان گنت" سے ایک مبہم کثیر تعداد مراد ہوتی ہے:

"ان گنت، بے حد، بے شمار، بے حساب، بے حد"
(فرہنگ آصفیہ ص ۲۰۷)

یہ لغوی تشریح خاص طور پر قرن کی، اس لیے ضروری ہے کہ مبہم طول زمانہ و تعداد کی تعیین کے لیے موضوع بحث کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے نہ مدت معین کی جا سکتی ہے نہ تعداد۔ "قرن" کے مفہوم میں تعین مدت کا اختلاف سیاق و سباق کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح سالہا سال کی بھی کوئی مطلق تعین مدت نہیں کی جا سکتی۔ یہ بھی اسی طرح ایک مبہم طویل مدت ہے۔ طبقات الارض کی ساخت کا ذکر ہو تو "سالہا سال" کنایۃً طویل تر ہوگا۔ کاروبارِ عشق میں بہ طریق مبالغہ آن واحد کو بھی جاوداں اور روزِ قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً

حساب عمر صد عاقل بحشر گذرد یک دم
حساب یک دم عاشق بصد محشر نگنجد

یا　ایک منظر نگہاں، سوزِ غم جاوداں
عشق کا آغاز ہی عشق کا انجام ہے

انسانی زندگی میں ایک مبہم طویل مدت مثلاً چالیس پچاس برس کے لیے "سالہا سال" کہنا بالکل درست ہوگا کسی جنرل یا "آواگون" ملنے کی ضرورت نہیں۔ "سالہا سال" وہاں بھی استعمال کر سکتے ہیں جہاں انگریزی میں year after year بولا جاتا ہے۔ یہی حال "ان گنت" کا ہے۔ مثلاً "شیخ جمن بہشتی نے اپنی بیٹی کی شادی میں ان گنت روپیہ خرچ کیا۔" یہاں شیخ جمن بہشتی کی ماہانہ آمدنی کا لحاظ کر کے چار سو یا پانسو روپے ہی ان گنت ہوں گے ہندستان کی قرض داری کا ذکر ہو تو ارب کھرب سے آگے بھی کچھ اور ان گنت کا مفہوم ہو سکتا ہے۔

غرض "سالہا سال" سے ایک مبہم طویل مدت اور "ان گنت" سے ایک مبہم کثیر تعداد مراد ہوتے ہیں۔ موضوع گفتگو کو پیش نظر رکھ کر اس کے تعین کا قیاس کرنا چاہیے۔

(ذکا صدیقی رامپور)

کچھ کربل کتھا کے بارے میں

۱۵ دسمبر کے "ہماری زبان" میں عنوان بالا کے تحت میں نے ایک بنیادی سوال اٹھایا تھا کہ کیا مولوی کریم الدین نے کربل کتھا کے اسی نسخے کا اقتباس پیش کیا تھا جو آج مطبوعہ صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس باب میں مرتبین کا یہ موقف ہے کہ دونوں نسخے ایک ہی ہیں لیکن میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ نسخۂ کریم الدین نسخۂ اشپرنگر سے مختلف تھا۔ اس کے ثبوت میں میں نے دونوں نسخوں سے چند جملے نقل کیے تھے اور اختلاف متن کی نشاندہی کی تھی۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی ثبوت نہیں۔ اس سے بڑے ثبوت کی اور کیا ضرورت ہے کہ کریم الدین کے پاس جو نسخہ تھا، اس میں "بارہ مجلس اور ایک خاتمہ" (طبقات ص ۱۱) تھا جب کہ مطبوعہ نسخے میں "ایک مقدمہ اور بارہ (بارہ) مجلس اور ایک خاتمہ" (کربل کتھا ص ۱۱) کا ذکر ہے۔ دوسرے الفاظ میں کریم الدین کے نسخے سے "مقدمہ" غیر حاضر تھا جس سے یہ شک بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ نسخۂ اشپرنگر میں جو مقدمہ ہے وہ الحاقی ہے۔

اسی عنوان کے تحت یکم جنوری کے "ہماری زبان" میں جناب ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اپنے موقف کی توثیق کرتے ہوئے کہا کہ کریم الدین نے غیر ضروری نثر کے جملے حذف کر دیے ہیں اور نثر کی عبارت سے شعر نکال دیے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اغلاط و تصرفات کی ایک اچھی خاصی فہرست پیش کی ہے لیکن نہ تو یہ فہرست نفس سوال کو حل کر سکی اور نہ ان کی پیش کردہ تاویل مرتبین کا یہ قول محتاج ثبوت ہے کہ کریم الدین نے غیر ضروری نثر کے جملے حذف کر دیے ہیں۔

جہاں تک اغلاط و تصرفات کا سوال ہے، ان کے وجود سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اغلاط و تصرفات کا تعین ہمیشہ اور ہر حال میں قوی تر دلائل کی روشنی میں

کیا جاتا ہے۔ یہ جو فاضل مضمون نگار نے محمد حسین آزاد سے لے کر حامد حسن قادری تک کے تصرفات کا ذکر کیا ہے، ان کا علم انھیں اسی وقت تو ہوا جب انھوں نے طبقات شعرائے ہند کا مطالعہ کیا۔ اسی طرح صاحب طبقات کی طرف جو تصرفات منسوب کیے جا رہے ہیں، ان کا بھی تو کوئی ماخذ ہوگا۔ مرتبین کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ صاحب طبقات نے غیر ضروری نثر کے حصے حذف کر دیے ہیں۔

میں متن سے استدلال کر رہا ہوں، مرتبین قیاس سے کام لے رہے ہیں۔ میں اس شخص کا قول نقل کر رہا ہوں جس کی زبان سے دنیا نے پہلی بار کربل کتھا کا نام سنا۔ مرتبین کی معلومات کا ماخذ و منبع ایک ایسا نسخہ ہے جس کے بارے میں وہ خود یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اس کی کتابت طبقات شعرائے ہند کی اشاعت سے پہلے ہوئی یا اس کے بعد۔

میں کہتا ہوں کہ میں نے اپنا موقف واضح کر دیا ہے۔ اس موضوع پر میری یہ آخری تحریر ہے اور اب مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔

(ڈاکٹر محمود الٰہی)

کچھ مہنگی کتابوں کے کم خرچ سلسلے کے بارے میں

ذکا صدیقی صاحب نے اپنے مضمون "مہنگی کتابوں کا کم خرچ سلسلہ" (ہماری زبان ۲۲ نومبر ۱۹۶۹ء) میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ "سرشار کے خوجی کے بعد چچا چھکن وہ دوسرا زندہ جاوید کردار ہے جس کی نقش گری کا سہرا اردو کے مشہور ادیب امتیاز علی تاج کے سر ہے"۔ تاج صاحب نے یا تو یہ سہرا زبردستی اپنے سر باندھ لیا ہے یا زبردستی ان کے سر باندھ دیا گیا ہے کیونکہ چچا چھکن کا زندہ جاوید کردار ان کی اپنی تخلیق ہرگز نہیں ہے۔ اس کردار کا خالق انگریزی ادب کا مشہور مزاح نگار جیروم۔ کے جیروم (JEROME K JEROME) ہے۔ چچا چھکن "انکل پاجر" UNCLE PODGER کا اردو چربہ ہے۔ "چچا چھکن نے تصویر ٹانگی" اور دوسرے مضامین جیروم کے UNCLE PODGER PUTS THE PICTURE وغیرہ سے مکمل طور پر ماخوذ ہیں اور ادبی سرقے کی ایک اچھی مثال ہیں۔ سرشار کا خوجی یا آزاد طبع زاد اور خالص ہندوستانی ہے مگر یہ بات چچا چھکن کے لیے نہیں کہی جا سکتی۔

"شیر کیا سوچتا ہوگا" کے متعلق مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ کتاب آج سے تقریباً بائیس تیئیس سال پہلے "آئینہ حیرت" کے نام سے ساقی بکڈپو نے شائع کی تھی۔ رفیق حسین صاحب کے یہ مضامین بھی پہلے رسالہ ساقی میں جب وہ دہلی سے شاہد احمد دہلوی کی ادارت میں نکلتا تھا، شائع ہو چکے ہیں۔

اس مجموعے کے بعد رفیق صاحب نے جو غالباً محکمہ جنگلات سے منسلک تھے لکھنا ترک کر دیا کیونکہ پھر ان کے مضامین کسی رسالے میں نظر نہیں آئے۔ اب وہ کیا کر رہے ہیں اور کہاں ہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ بہرکیف یہ مضامین اردو میں اپنی نوعیت کے بہترین مضامین میں سے ہیں اور شاید مشہور انگریز شکاری جم کاربٹ JIM CORBETT کی تخلیقات سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت ہیں۔

(عباس ازل)

اردو دوستوں سے اپیل

سرائے امانت خاں ضلع امرتسر سرحد پاک کے عین قریب واقع ہے اور اس مقام پر اردو کالج اور لائبریری کا قائم ہونا خالی از تعجب نہیں۔ پنجاب میں اردو بدستور قائم ہے گرچہ نئی پود ہندی پنجابی کی تعلیم حاصل کر رہی ہے مگر طالبان اردو کو مفت اردو پڑھانے کی کوشش جاری ہے۔ اخبارات کے مدیران کو چاہیے کہ وہ اخبارات اور دیگر اشاعتیں برائے افادۂ عام اردو کالج کو ضرور بھجوا دیا کریں۔ کالج میں طلبا کی تعداد چھ سات تک ہے امید ہے کہ یہ تعداد بڑھے گی۔

(پرنسپل اردو کالج و لائبریری پوسٹ آفس سرائے امانت خاں امرتسر)

سہیل اکیڈمی کا قیام

اردو کے مشہور شاعر جناب اقبال سہیل کی یاد میں جونپور میں سہیل اکیڈمی قائم کی گئی ہے اس اکیڈمی کے حسب ذیل مقاصد ہیں۔

اقبال سہیل کے تنقیدی مضامین اور اُن کی شاعرانہ تخلیقات کا جائزہ لیا جائے اور انھیں سلیقہ سے ترتیب دے کر منظر عام پر لایا جائے۔

اپنی فطری بے نیازی کی بنا پر سہیل نے اپنے زادہ ہائے طبع کو یکجا نہیں کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے کلام کا ایک حصہ ضائع ہو گیا اور جو بچ رہا ہے اُس کے بہت سے اجزا دوستوں اور عقیدت مندوں میں منتشر ہو گئے۔

"سہیل اکیڈمی" اِن منتشر غیر مطبوعہ اجزا کو بھی مدون کر کے منظر عام پر لائے گی۔

چونکہ سہیل نے ہر صنف سخن کو صالح صحت مند اور حیات آفریں فکر کے ساتھ ساتھ تخیل اور اسلوب کی ایک نئی آب و تاب عطا کی ہے، اس لیے "سہیل اکیڈمی" صنفِ سخن کے اعتبار سے ان کے کلام پر الگ الگ تنقیدی کتابیں بھی شائع کرے گی۔

سہیل کے کلام کو دیوناگری رسم الخط میں بھی منتقل کرے گی۔

باقاعدگی کے ساتھ ہر سال "یوم سہیل" منائے گی جس میں علمی و ادبی مجلس مذاکرہ (سمپوزیم) کے ساتھ ساتھ اعلیٰ سطح پر محفل سخن بھی آراستہ ہوگی۔

"سہیل اکیڈمی" کا ابتدائی نصب العین وہی ہے جسے اوپر پیش کیا گیا، لیکن اس نصب العین کے ساتھ ساتھ اس کے چند اور مقاصد ہیں جو علی الترتیب ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

جدید وقدیم ادبا و شعرا میں سے اُن ارباب فکر و فن سے ملک کو روشناس کرائے گی جن کی عظمت مختلف وجوہ کی بنا پر دب سی گئی ہے۔

اُن تخلیقات کو منظر عام پر لائے گی جو حیات آفریں جمالیاتی قدروں کا پرتو ہوں، اور انسانی وجدان کو مسرور و کیف عطا کر سکیں۔

ہر اُس فن پارے کو شائع کرے گی جو قومی ہم آہنگی، سیاسی و معاشی مساوات، انسانی وحدت، انسانی شرف، انسانی آزادی، انسانی امن و مسرت، اور انسانی عروج و ارتقا کا واضح تصور رکھتا ہو۔

ہر اس تحریک کی مخالفت کرے گی جو جاگیرداری، سرمایہ داری، طبقہ واریت، آمریت، اور فرقہ وارانہ کشاکش کی حامی ہو۔

اُس ادبی تحریک کو بھی ہدف تنقید بنائے گی جس کی بنا پر شعر و فن کی نزہت گاہ جمال میں فحاشی، جنسی انارکی، مجہولیت، سماجی فرار، یاسیت اور لذت پرستی جیسے تخریبی عناصر راہ پا سکیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ابھرنے والے فنکاروں کی اچھی تخلیقات کا انتخاب مع تعارف کے گاہے گاہے شائع کرے گی۔

ادبی و تہذیبی ورثہ کی قدر و قیمت کا از سر نو تجزیہ (REVALUATION) کرے گی۔

چونکہ افریقہ اور ایشیا کے نو آزاد ممالک کے بیشتر مسائل ایک سے ہیں، اس اعتبار سے ہر جگہ کی جدید ادبی اقدار بھی تقریباً ایک سی ہیں، توافق کی بنا پر افرو ایشیائی ادیبوں سے رابطہ رکھے گی۔

قومی یکجہتی کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ہندوستان کے ہر خطے اور ہر فرقے کا بجا طور پر احترام کریں اور لسانی نامراج اور تشدد اگر کسی گوشہ سے بھی ابھر رہا ہو تو اسے دبانے کی کوشش کریں۔ "سہیل اکیڈمی" اس وسیع تصور کے تحت ہندوستان میں لسانی توافق کو اپنا مقصد جانے گی اور اس سلسلہ میں لسانی تصادم کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔

اردو ہندوستان کی تہذیبی رنگا رنگی کا پرتو ہے۔ سہیل اکیڈمی اس کی ترویج و اشاعت اور اس کے عروج و ارتقا میں بھرپور حصہ لے گی۔

علم و ادب کے ہر شعبہ میں تحقیقی یا اختراعی فکر (ORIGINAL THINKING) کی خاص طور سے ہمت افزائی کرے گی۔

چونکہ سہیل نے دبستان شبلی کے گہوارہ علم و فن میں تربیت پائی تھی، اس نسبت سے "سہیل اکیڈمی" حلقہ شبلی کے اکابر مثلاً ابوالکلام آزاد وغیرہ پر تحقیقی اور تنقیدی مقالات کتابی صورت میں شائع کرے گی۔

"سہیل اکیڈمی" کے لیے جلد ایک عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے گی جس میں اردو کے کچھ محقق ادیب شاعر باضابطہ تصنیف و تالیف کا کام کریں گے۔ اکیڈمی ایک کتب خانہ بھی قائم کرے گی۔

"سہیل اکیڈمی" اپنا ایک علمی اور ادبی ترجمان ماہنامہ کی شکل میں نکالے گی جو اس کے تصورات اور ہمہ گیر ادبی نظریات کو وقت و حالات کے ساتھ ملک میں پھیلائے گا۔

"سہیل اکیڈمی" باقاعدگی کے ساتھ پندرہ روزہ یا ماہانہ ادبی نشست منعقد کرے گی جس میں ادیب شاعر اپنی تخلیقات پیش کریں گے۔ اکیڈمی ان تخلیقات کو محفوظ رکھے گی اور ان کا انتخاب شائع کر کے منظر عام پر لائے گی۔

افتخار اعظمی

(سہیل اکیڈمی مرکزی دفتر - بلوا گھاٹ جونپور)

اردو تعلیم کی ترقی و توسیع کے لیے حکومت کی مراعات

حیدرآباد۔ ۷ جنوری حکومت آندھرا پردیش نے یقین دلایا ہے کہ ریاستی معاملات میں علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کے مرحلے میں اردو کو بھی حق مقام دینے کا سوال اور مطالبہ کا خاص لحاظ رکھا جائے گا جناب این بھگوان داس آئی اے ایس معتمد تعلیم نے حکومت کے اس نقطۂ نظر سے ایک مکتوب کے ذریعہ واقف کرایا ہے۔ جناب ایم بارگا ریڈی ایم۔ ایل۔ اے نے آج اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے ریاست میں اردو تعلیم کی ترقی و توسیع سے متعلق حکومت کی جانب سے بعض نئی سہولتوں اور مراعات کی تفصیلات سے واقف کرایا حکومت آندھرا پردیش نے اس مطالبہ کو قبول کرلیا ہے کہ ایک بار کسی اردو جماعت کے قیام اور اس سلسلہ میں طلبہ کی ضروری تعداد کے حصول کے بعد آئندہ اعلیٰ جماعتیں خود بخود قائم کردی جائیں گی حکومت نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ نظامت تعلیمات میں ایک اردو جاننے والے نائب ناظم کا انتظام کیا جاچکا ہے۔ حکومت آندھرا پردیش نے اردو ذریعہ تعلیم کے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجات بھی سائنس اور اردو ٹرینڈ گریجوئیٹس کی کمی و قلت کے مسئلے سے نپٹنے کے لیے آندھرا پردیش پبلک سروس کمیشن سے ٹرینڈ سائنس گریجوئیٹس کی بھرتی کا انتظام کرنے کی خواہش بھی کی ہے۔

اجین گرلس ڈگری کالج کی بزم ادب کا افتتاح

اجین۔ ۵ دیدیہ ڈاک) اردو ہندی کا تنازعہ چند خودغرض سیاسی مفاد پرستوں کا کھڑا کیا ہوا ہے۔ اردو کا ہندی سے کوئی بیر نہیں۔ لیکن ہر پھول کو کھلنے دو کے اصول پر کاربند رہ کر وہ اپنے زندہ رہنے اور پھولنے پھلنے کا حق چاہتی ہے اور اس کا یہ حق کوئی چھین نہیں سکتا۔"

یہ الفاظ حمیدیہ کالج بھوپال میں شعبہ اردو کے قائم مقام صدر پروفیسر آفاق احمد نے مقامی گرلس ڈگری کالج کی بزم ادب کا افتتاح کرتے ہوئے کہے۔

شروع میں گرلس ڈگری کالج کی بزم ادب کی نگراں پروفیسر مس امین سلطان نے مہمان کا تعارف اور ان سے بزم کا افتتاح کرنے کی درخواست کی۔

جلسہ میں بڑی تعداد میں اسٹاف ممبر ان اور طالبات نے شرکت کی۔ بعد میں ایک پرتکلف پارٹی بھی ہوئی۔

(محی الدین ناگوری)

گوالیار میں نئی نظم پر مذاکرہ

گوالیار ۳۰ ر دسمبر

انجمن ترقی اردو گوالیار کی جانب سے مقامی تعلیمی وتہذیبی ادارہ گیان ادوے، کی عمارت میں بمبئی سے آئے ہوئے نوجوان شاعر ندا فاضلی کے اعزاز میں ایک خاص نشست کا انعقاد کیا گیا۔ نئی نظم پر تقریر کرتے ہوئے ندا فاضلی نے کہا کہ اردو کی نئی نظم اپنے روپ، موضوع اور زبان کے لحاظ سے اپنے سے پہلے کے دور کی نظم سے بالکل مختلف ہے، اور یہ اختلاف کا شعور ہی نئے عہد کے نئے حالات میں نئی اقدار کی کھوج کا ثبوت ہے۔

نشست کی صدارت نئی پیڑھی کے مشہور ہندی کہانی کار جناب شانی نے کی۔ شانی صاحب نے اپنی صدارتی جملوں میں ہندوستانی ادب میں جدید رجحانات کے تاریخی امکانات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا ہمیں اپنے ادب کو عالمی اقدار کی روشنی میں جانچنے پرکھنے کی ضرورت ہے ہندی میں پہلی بار سچے انسان کو زبان ملی ہے اور میرے خیال میں اردو میں بھی آزادی کے بعد ہی سے نئی نظم کی بھرپور اٹھان پائی جاتی ہے۔

دستار صدیقی، گلشن تلوانی، رام پرکاش ترپاٹھی، گووندائے نوودت، نثار پرویز اور رام بلاس شرما نے بحث میں حصہ لیا۔

اسلام الدین قریشی
سکریٹری انجمن ترقی اردو گوالیار

تبصرے

رگِ جاں خورشید الاسلام

قیمت: ۲ روپے ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ

ایک ناقد کی حیثیت سے ڈاکٹر خورشید الاسلام اردو کے ادبی حلقوں میں کافی عرصے سے روشناس ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام "رگِ جاں" انھیں ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے جس نے اپنے پرانے ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی صلاحیتوں سے کام لینا جانتا ہے۔ خورشید الاسلام روایت کے جاندار عناصر کا شعور رکھتے ہیں اور یہی صفت ان کی شاعری کی مجموعی خصوصیت بھی کہی جا سکتی ہے۔

"رگِ جاں" کا نمایاں حصہ غزلوں پر مشتمل ہے جن میں شاعر کی شخصیت واضح طور پر کارفرما نظر آتی ہے۔ ان غزلوں میں اگر ایک طرف ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کا اظہار موجود ہے تو دوسری طرف مروجہ اخلاقی اقدار کے خلاف انفرادی بغاوت کا احساس بھی ملتا ہے۔ زندگی کے حقائق کے بارے میں خورشید الاسلام کا ردعمل ایک ایسے شخص کا ہے جو زمانے کے طور طریقوں کا مخالف ہوتے ہوئے اپنے جانے ہوئے اصولوں کی صحت اور صداقت پر سختی سے یقین رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس رجحان میں cynicism کے پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ شاعر کے خلوص اور جذبے کی گہرائی سے لگایا جائے گا۔

نظموں میں کئی چیزیں اپنے بیان اور تاثر کے اعتبار سے جدید ذہن کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان میں کہیں کہیں اشاریت بھی جھلکتی ہے۔ نظم "پیاس" اس کی کامیاب مثال ہے۔

اس دور میں جو لوگ جدت کے تقاضوں کو روایت دشمنی کے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں ان کے لیے خورشید الاسلام کا کلام اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعری کا نیاپن روایت سے کنارہ کشی نہیں بلکہ اس کے صحیح شعور پر مبنی ہے۔

(منیب الرحمٰن)

سن سمجھاون

مصنف: شاہ تراب

مرتب: ڈاکٹر سیدہ جعفر

اٹھارویں صدی کے ایک دکنی صوفی شاعر کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت رکھنے والی نظم جو دو سو سال سے مخطوطات کے انبار میں دفن تھی، پہلی بار ہمارے سامنے آئی۔ اس دریافت کے لیے ڈاکٹر سیدہ جعفر ہندوستانی تہذیب اور اردو ادب کے مورخوں کے شکریے کی مستحق ہیں اس لیے کہ انھوں نے ہماری مشترک تہذیب کی ایک ایسی کڑی ڈھونڈ نکالی ہے جس کے بغیر اردو کے سیکولر مزاج اور انسان دوستی کی روایت تشنۂ تکمیل رہتی۔ شاہ تراب میر، سودا، درد اور مرزا مظہر جانجاناں کے ہم عصر ہیں۔ ان کے زمانے تک اردو شاعری تشکیلی دور سے گزر کر اس منزل تک پہونچ چکی تھی جب آوازوں اور لہجوں کی انفرادیت نمایاں ہونے لگی تھی۔ شاہ تراب اگرچہ اب تک ایک غیر معروف شاعر رہے ہیں لیکن ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا لہجہ اور ان کے موضوعات ہماری شاعری کے ایک ایسے رُخ کی نشاندہی کرتے ہیں جن کی اب تک کچھ کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ عام طور پر اردو شاعری پر بعض حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ہندوستانیت کی کمی ہے، اگرچہ اس اعتراض کو رفع کرنے کے لیے ہمارے پاس محمد قلی قطب شاہ، نظیر، انشا اور گجرات و دکن کے قدیم صوفی شعرا کا کلام موجود تھا لیکن اب ہم ایک ایسے شاعر کے کلام سے روشناس ہوئے ہیں جس کے یہاں ہندو اور مسلم رام اور رحیم کی دوئی مٹی ہی نہیں ؎

صفت کر اول اس کی جو رام ہے گا
اسی رام سوں ہم کو آرام ہے گا
ایک نام اللہ نرنجن ہری ہے
نرنکار نرگن دو پر ملیسری ہے

عام طور پر سب ہی اردو شاعر حمد سے اپنی مثنوی یا نظم کا آغاز کرتے ہیں۔ لیکن حمد کا یہ انداز جرأت مندانہ بھی ہے اور مذہبوں کے امتزاج کا ثبوت بھی۔ ہماری مشترک تہذیب کو پروان چڑھانے میں صوفیا اور بھگتوں نے جو اہم کارنامے انجام دیئے ہیں ان کے ذکر کے بغیر ہم اپنے تہذیبی کردار کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اب اس راہ میں شاہ تراب کا نام ایک اہم سنگ میل کی طرح یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے مہاراشٹر کے مقبول عام سنت کوی داس رام کی مشہور تصنیف "مناچے شلوک" کی بنیاد پر اپنی نظم "سن سمجھاون" لکھی ہے۔ رام داس اپنی وسیع النظری اور صلح کل مشرب کی وجہ سے ہر مذہب و ملت میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی تصنیفات کا اثر شاہ تراب پر کافی نمایاں ہے۔ انھوں نے مناچے شلوک کے علاوہ "داسا بودھ" سے بھی اپنی اس نظم میں اثر قبول کیا ہے۔ وہ رام داس کے سلسلے کے دوسرے سنتوں کیسو سوامی اور بھیا سوامی کو بھی اپنا ہم مشرب جانتے ہیں۔ ان سنتوں سے ان کے شخصی مراسم بھی کافی پر خلوص تھے۔ شاہ تراب چشتی سلسلے میں بیعت تھے، چشتی سلسلہ ہمارے ملک کی تاریخ میں جس روحانی اور مذہبی اتحاد

کا علمبردار رہا ہے شاہ تراب اُس کے مکمل نمائندے نظر آتے ہیں، جو لوگ تصوف کو خالص اسلامی نظریہ سمجھتے ہیں اُن کو دارا شکوہ کے علاوہ شاہ تراب ایسے صوفیوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے جنھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ صوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اس کا مذہب انسانیت اور خداپرستی ہے۔ ان کا خدا مختلف مذاہب کی اصطلاحات اور جھگڑوں سے ماورا ہے شاہ تراب ہندوستانی تصوف اور یکجہتی کی مشترکہ روایات کے پروردہ اور علمبردار ہیں۔ اگر ایسے شاعروں کا اور کلام خصوصیت سے اسے تحقیق کی روشنی میں سامنے لایا جائے تو یہ ملک کی تہذیب اور ادب کی ایک قابلِ قدر خدمت ہوگی۔ آج "قومی یکجہتی" کا نعرہ ہمارے یہاں سیاسی نعرہ بن گیا ہے لیکن تہذیبی اور مذہبی سطح پر ہمارے روشن خیال صوفیوں اور سنتوں نے اسے آج سے کئی صدی پہلے ہی ایک حقیقت بنا دیا تھا۔ اگر ہماری سیاست اور قومی جدوجہد ان روایات سے آشنا ہوتی اور ان کے سایے میں پروان چڑھتی تو شاید آج ہمیں تعصب، تنگ نظری، زرپرستی اور مذہبی تفرقہ اندازی کے تہذیب فرسا مسایل سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔

شاہ تراب کی اس نظم کے چھ مخطوطات کا مقابلہ کر کے ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بہت محنت اور دقتِ نظر سے من سمجھاون کو ترتیب دیا ہے یہاں بعض محققین کی ان غلطیوں کا ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا جن سے مرتب کو دوچار ہونا پڑا۔ سالار جنگ لائبریری میں من سمجھاون کا جو نسخہ ہے اس کا نام نصیر الدین ہاشمی نے فہرست مخطوطات میں "علی نامہ" درج کیا تھا، اس غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ من سمجھاون کا یہ تذکرہ یا مخطوطہ اس بند سے شروع ہوتا ہے جس میں حضرت علیؓ کی مدح کی گئی ہے ؎

کشن جس کو کہتے علی نام ہے گا

اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد کی وضاحتی فہرست میں اس نظم کا نام "دوازدہ بحر یا بارہ بحر" لکھا گیا ہے۔ اسی کتب خانے کے دوسرے مخطوطے کا نام "کلام تراب" بتایا گیا ہے۔ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں مصنف کا نام "حسینی برہمن" درج کیا گیا ہے کیونکہ شاہ تراب نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

حسینی برہمن اسے نام داری

ان غلط بیانیوں سے ہمیں مخطوطات کی فہرست مرتب کرنے والوں کی غیر ذمہ داری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ پورے مخطوطے کا مطالعہ کرنے کی زحمت بھی نہیں کرتے اور اگر ایک ہی کتاب کے دو مختلف مخطوطے ہوں تو بغیر کسی کاوش کے انھیں دو الگ کتابیں مان لیتے ہیں۔ سیدہ جعفر نے محققین کی ان گمراہ کن رہبریوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا اور ایک دیانت دار محقق کی طرح سنی سنائی غیر ذمہ دارانہ باتوں پر اعتبار کرنے کے بجائے خود ہر مخطوطے کے مطالعے اور دوسرے نسخوں سے اس کے موازنے کی زحمت اٹھائی اس لیے ان کا مرتب کیا ہوا "من سمجھاون" کا یہ نسخہ ایڈیٹنگ کے ایک اعلیٰ نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔

سیدہ جعفر نے صرف نظم کی ایڈیٹنگ ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پوری محنت سے مختلف ماخذوں کی چھان بین کر کے شاہ تراب کی زندگی اور ان کی تصنیفات کا ایک مستند خاکہ بھی پیش کیا ہے انھوں نے رام داس اور ان کے سلسلے کے دوسرے سنتوں کے متعلق بھی ضروری مواد فراہم کر دیا ہے۔ اور آخر میں ہندو فلسفے کی ان اصطلاحات کی ایک فرہنگ بھی دے دی ہے جنھیں شاہ تراب نے اپنی نظم میں جا بجا استعمال کیا ہے۔ اس فرہنگ سے کتاب کی افادیت اور بڑھ گئی ہے کیونکہ شاہ تراب کی اصطلاحات بڑی حد تک ہندوی ہیں۔ یہ بھی ان کے تصوف کی ایک منفرد خصوصیت ہے جو خود تصوف کے علما و محققین کو نئے نقطۂ نظر سے کام کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

ہماری تحقیق کا ایک بنیادی اور ضروری کام یہ ہے کہ اہم شاعروں کے وہ دواوین اور نظمیں جو اب تک مستند متن کے ساتھ شایع نہیں ہوئیں، انھیں ترتیب دے کر شایع کیا جائے سیدہ جعفر اس سے پہلے ماسٹر رام چندر کے حالات و مقالات کا مستند ایڈیشن شایع کر چکی ہیں اور اب انھوں نے اپنی اس تحقیق سے اس ضرورت کی تکمیل کی طرف دوسرا قدم اٹھایا ہے۔ سیدہ جعفر نے اپنے اس تحقیقی کارنامے سے ہماری تہذیبی اور ادبی تاریخ کی ایک ضروری کڑی فراہم کر دی ہے۔ ہم اُن سے بجا طور پر توقع کر سکتے ہیں کہ وہ شاہ تراب کی دوسری تصنیفات کے بھی مستند ایڈیشن شایع کریں گی کیونکہ اس کتاب کے مطالعے سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ تراب کی اہمیت صرف تاریخی نہیں بلکہ وہ شاعرانہ علمی اور تہذیبی اہمیت کے بھی حامل ہیں۔

اس کتاب کو ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد نے شایع کیا ہے۔ کتاب عمدہ کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ اردو ادب کے ہر طالب علم کے لیے ضروری اور تحقیق کا شوق رکھنے والوں کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ ہمارے ادب کا کوئی مورخ اس کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

(وحید اختر)

"ہماری زبان"
سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ پرنٹر ظہیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور نذیر حسن پبلشر نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا